DELHI UNIVERSITY
LIBRARY

DELHI UNIVERSITY LIBRARY

Cl. No. O168,1L97G N48

Date of release for loa

Ac No 94551 5.11.57

This book should be returned on or before the date last stamped belov An overdue charge of one anna will be charged for each day the book kept overtime.

غالب

اسداللہ خاں غالب کے سوانح حیات اور انتخابِ کلام

فیروز سنز

پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

لاہور —— کراچی —— پشاور

۹۵-۳ سرکلر روڈ — میکلوڈ روڈ — ۳۵-دی مال

پہلی بار — سنہ ۱۹۴۸ء — قیمت عہ

فہرس

	صفحہ
پیش لفظ	۵
حالاتِ زندگی	۷
پیدائش	۸
دہلی میں	۹
مشکلات کا سامنا	۱۲
پنشن کا قضیہ	۱۴
کلکتہ کا سفر	"
فریزر کا قتل	۱۷
غالب جیل میں	۱۹
رہائی	۲۱
استادِ شاہ کی حیثیت میں	۲۳
دلی کی تباہی	۲۷
آخری عمر اور وفات	۲۸
اخلاق و عادات	۳۰
استغنا اور بے نیازی	۳۲
قصائد میں بھی امتیازی شان	۳۷
ظرافت اور شوخیِ طبع	۴۳
غزل گوئی میں غالب کا مرتبہ	۴۸
غالب کی مقبولیت اور قدردانی	۵۱
کلام کا انتخاب	۵۷

پیش لفظ

غالب اور غالب کے کلام پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ابھی بیسیوں اور لکھی جائیں گی۔ لیکن اِس وقت تک غالب کے متعلق کوئی ایسی کتاب نہیں شائع ہوئی جو مختصر اور عام فہم ہونے کے علاوہ سوانح، تنقید اور انتخاب کے لحاظ سے جامع اور مکمّل ہو۔ بعض کتابوں میں صرف تنقید ہے اور بعض محض سوانح سے متعلق ہیں۔ اِن دونوں کو اختصار کے ساتھ کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں کیا گیا۔

"غالب" کی تالیف میں اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ اس دیرینہ ضرورت کو پُورا کیا جائے۔ اس کی ترتیب بالکل سیدھی سادی ہے۔ پہلے حصّہ میں غالب کی زندگی کے تمام اہم اور مستند واقعات دِل نشیں انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ دُوسرے حصّہ میں غالب کے کلام پر ابتدائی تنقید ہے۔ تیسرے حصّہ میں 'دیوانِ غالب' کا انتخاب ہے۔ اس میں بھی یہ لحاظ رکھا

گیا ہے کہ مبہم اور مشکل اشعار نظر انداز کر دیئے جائیں اور صرف ایسی غزلیں اور اشعار منتخب کیے جائیں جو نہ صرف مقبول اور معنی کے لحاظ سے صاف اور واضح ہیں بلکہ جو غالب کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش بھی کرتے ہیں۔

فیروز سنز

غالبؔ

حالاتِ زندگی

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اردو زبان کے چوٹی کے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے جب ہندوستان ہر اعتبار سے انحطاط پر تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ دہلی میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی برائے نام حکومت ضرور تھی لیکن اس چراغِ سحری کے خموش ہونے کا وقت قریب آ پہنچا تھا۔ رونا صرف حکومت کے چھن جانے کا نہیں بلکہ اس کا بھی تھا کہ تعلیم، تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے بھی ملک اس وقت پستی کی گہرائیوں میں گر چکا تھا۔ کسے امید تھی کہ ان حالات اور اس ماحول میں ایک ایسا شاعر پیدا ہوگا جو نہ صرف اپنے ہم عصروں سے عقیدت کا خراج وصول کرے گا بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس کا نام عزت کے ساتھ لیں گی اور اس کے کلام کو سر آنکھوں پر رکھیں گی۔

پیدائش

مرزا غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ ترکی نسل سے تھے اور فکرِ معاش کے سلسلہ میں اپنے اصل وطن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان آگئے تھے۔ غالب کے دادا سلطان زادہ رستم خاں غالب کے بزرگوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کی پیدائش سے فقط پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں پہلے لکھنؤ اور اس کے بعد کافی مدت تک حیدرآباد میں ملازم رہے۔ لیکن غالب کی تربیت آگرہ میں ان کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کی نگرانی میں ہوئی۔

بچپن

غالب پانچ برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کا بار اپنے اوپر لیا۔ لیکن قدرت نے انھیں اس کا زیادہ موقع نہ دیا اور چار پانچ برس بعد وہ بھی اپنے بڑے بھائی سے جا ملے۔ ان کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا کے سایۂ عاطفت میں آگئے۔ جن کا خاندان آگرہ کے امیر گھرانوں میں سے تھا مرزا کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ چنانچہ ہر ممکن عیش و آرام اور آزادی حاصل رہی۔ لیکن لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ ان کے نانا نے تعلیم کا بھی بہت خیال

رکھا۔ اور آگرہ میں جو قابل ترین اُستاد بل سکتے تھے، مرزا کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے ایک اُستاد نظیر اکبر آبادی بھی تھے۔ جو اُردو شاعری میں ایک خاص رنگ کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ غالب کو فارسی سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کے ایک اُستاد مولوی محمد معظم آگرہ کے سب سے مشہور عالم تھے۔ غالب میں فارسی زبان اور ادب کا شوق اُن ہی نے پیدا کیا۔ فارسی زبان پر قدرت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ غالب نے گیارہ برس کی عمر میں فارسی میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ اور ظہوری اور فارسی کے دوسرے شعرا کا کلام پڑھنے اور سمجھنے لگے تھے۔

شادی

مرزا کی شادی تیرہ ہی برس کی عمر میں مرزا الٰہی بخش معروف کی لڑکی سے ہوگئی۔ معروف ایک ذی عزت، خوش حال اور خاندانی آدمی تھے۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ذوق کے شاگرد تھے اور بڑے پاکیزہ اور پُر تاثیر شعر کہتے تھے۔

دہلی میں

کسی تذکرے سے ٹھیک طور پر پتہ نہیں چلتا کہ مرزا دہلی کب آئے؟ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دہلی آنا جانا اُسی وقت سے شروع ہوگیا تھا جب ان کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ ان کے چند خطوط سے یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے غالباً پندرہ سولہ برس کی عمر میں آگرہ چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی

میں سکونت اختیار کی۔ سکونت کی یہ تبدیلی مرزا غالب کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اگر وہ آگرے میں ہی رہتے تو شاعری میں اس بلند مرتبہ کو کبھی نہ پہنچ سکتے۔ آگرہ میں شاعروں اور شاعری کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی ابتدا میں غالب کا رنگ بھی بہت مشکل تھا۔ اور وہ مشہور فارسی شاعر بیدؔل کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان ہی کے رنگ میں شعر کہا کرتے تھے۔ اس لئے ان کے اکثر عجیب وغریب اشعار آگرے کے سخن فہموں کی سمجھ میں نہ آتے۔ ادھر غالب ان لوگوں کے اعتراضات پر جز بز ہو کر اور پیچ وتاب کھاتے ان ہی معترضین سے چڑ کر انھوں نے آگرے میں یہ رباعی کہی تھی ؎

مُشکل ہے زبس کلام میرا اے دِل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا نے اس رباعی میں جن لوگوں کو طنزاً سخنورانِ کامل کہہ کر گویا ان کی ہجو ملیح کی ہے ان کے اکثر اعتراضات جائز اور حق بجانب ہوا کرتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر وہ ساری عمر آگرے میں گزار دیتے تو ہمیشہ برخود غلط رہتے اور کبھی شاعری میں اپنے اصلی مقام کو نہ پہچان سکتے۔

دہلی کا ادبی ماحول

اس زمانے میں دہلی کا ماحول بھی ادبی لحاظ سے بیحد خوشگوار تھا۔ شعرا میں

شاہ نصیر، ذوقؔ مومنؔ ۔ علما میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل، شاہ عبدالقادر حضرت سید احمد بریلوی، مولانا فضل حق خیرآبادی ۔ طبیبوں میں حکیم محمود خاں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم رضا خاں اور نقادوں میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ موجود تھے ۔ خوش قسمتی سے مرزا غالبؔ کو مولانا فضل حق اور نواب شیفتہ ایسے صاحبانِ علم و فن اور مُسلّم اُستادوں کی دوستی اور قربت کی نعمت حاصل ہوگئی ۔ ان بزرگوں نے غالبؔ کو ان کے اشعار کی خوبیوں اور نقائص سے آگاہ کیا۔ مرزا جن میں جوہرِ قابل موجود تھا صحیح راہ پر پڑے تو تھوڑے ہی عرصے میں شاعرانہ عظمت کے آسمان تک جا پہنچے ۔ اگر مرزا دہلی نہ آتے اور انھیں شیفتہ اور فضل حق کی صحبت میسر نہ ہوتی تو وہ کبھی اپنی شاعری کا رُخ نہ بدلتے ۔ اور زندگی بھر ایک مہمل گو شاعر بنے رہتے ۔

دہلی آنے کے بعد غالبؔ کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اس کی ایک اور وجہ بھی ہے ۔ یہاں آکر انھوں نے نہایت غور و خوض سے ہندوستان کے فارسی شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا ۔ اور اس کے بعد ان کا رنگ اختیار کیا ۔ غالبؔ کی شہرت ایک اُردو شاعر کی حیثیت سے ہے ۔ لیکن یہ معلوم کرنا بیحد دلچسپ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی اُردو شاعر کی پیروی نہیں کی ۔ بلکہ اُردو زبان میں شعر کہنے کے لئے بھی پہلے بیدلؔ اور بعد میں عُرفیؔ اور نظیریؔ کا رنگ اختیار کیا جو فارسی زبان کے شاعر ہیں ۔ وہ میرؔ کے مداح تھے ۔ اپنے دیوان میں انھوں نے میرؔ کا ذِکر عزت اور ادب کے ساتھ کیا ہے ۔ اور انھیں ریختے کا اُستاد مانا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
سُنتے ہیں پہلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

لیکن "غالب نامہ" سے یہ صاف ظاہر ہے کہ میرؔ کی غزلوں پر جو غزلیں انھوں نے کہی ہیں وہ بھی میرؔ نہیں بلکہ بیدلؔ کے رنگ میں ہیں۔ اور اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اُردو ہے لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔

مشکلات کا سامنا

غالبؔ کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ عیش و آرام میں گزرا۔ ان کے ابتدائی کلام میں اس رنگین زمانہ کی طرف جابجا اشارے موجود ہیں۔ وہ کافی عرصہ تک نواب احمد بخش کے ساتھ فیروز پور جھرکا ضلع گوڑگاؤں میں مقیم رہے۔ لیکن سنہ ۱۸۲۶ء سے مرزا کی مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ غالبؔ کو اپنے چچا مرزا نصراللہ بیگ کے وارث کی حیثیت سے ایک جاگیر ملی تھی۔ لیکن بعد میں یہ جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل کر لی گئی۔ نواب احمد بخش کی وفات پر ان کی جائیداد کی تقسیم کے متعلق جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ غالبؔ کو بھی اس قضیہ کے سلسلے میں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ لارڈ لیک کی عملداری میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے۔ اس کے صلہ میں انھیں ذاتی زرِ معاوضہ کے علاوہ اپنی زندگی تک معقول جائیداد بھی ملی تھی۔ لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو سرکار نے ان کے وارثوں اور

متعلقین کے لئے فیروز پور جھرکا کی ریاست سے پنشنیں مقرر کردیں۔ یہ ریاست نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل تھی۔ مرزا غالب یہ کہتے تھے کہ ان کے اپنے اور شرکائے حقیقی کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔ لیکن نواب احمد بخش انھیں فقط تین ہزار روپیہ سالانہ دیا کرتے تھے اس رقم میں مرزا غالب کا حصہ صرف ساڑھے سات سو روپیہ تھا۔ جب تک نواب احمد بخش کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے رہے انھیں اس حق تلفی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ نواب ان پر مہربان تھے اور ان کی امداد اور خبرگیری کرتے رہتے تھے۔ لیکن ۱۸۲۶ء میں مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے انتقال کر گئے تو نواب احمد بخش نے غالب سے آنکھیں بدلنی شروع کر دیں۔ اس سے غالب کو بہت تکلیف ہوئی کیونکہ اس وقت تک انھیں کبھی کسی قسم کی مالی مشکلات نہیں پیش آئی تھیں۔ گو ان کی عمر تیس اکتیس سال کی تھی لیکن ان میں اور ایک ایسے امیر زادے میں جس نے تمام عمر عیش و عشرت میں گزاری ہو کوئی فرق نہیں تھا۔ نواب احمد بخش کی بے رُخی کا اثر یہ ہوا کہ جن لوگوں نے غالب کو اس امید پر قرضے دئے تھے کہ کھری آسامی ہے جب چاہیں گے وصول کر لیں گے۔ انھوں نے اب پنشن کم دیکھ کر تقاضے شروع کر دئے۔ اس کے علاوہ مرزا کو اس زمانے میں سب سے بڑا صدمہ یہ پہنچا کہ چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا جس سے بے اندازہ محبت تھی۔ ان کے خطوں میں بھی جہاں کہیں اس کا ذکر آیا ہے ایک ایک لفظ سے والہانہ اُلفت کی بُو آتی ہے۔

پنشن کا قضیہ

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ پنشن کے جھگڑے نے غالب کو بہت پریشان کیا۔ اس قضیئے کو ان کی زندگی میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی پنشن کی خاطر انھیں انگریز افسروں کی شان میں وہ قصیدے لکھنے پڑے جن کی وجہ سے بعض نقادوں نے ان پر خوشامدی ہونے کا الزام لگایا ہے در اصل اپنا حق حاصل کرنے کے لئے انھیں یہ پاپڑ بیلنے پڑے۔ سب سے پہلے تو وہ خود نواب کی خدمت میں فیروز پور جھرکا پہنچے۔ نواب ان دنوں الور میں تھے اس لئے مرزا وہیں ٹھہر کر ان کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن یہ سفر اور قیام بے سود ثابت ہوا کیونکہ نواب نے الور سے واپسی پر انھیں ٹکاسا جواب دے دیا۔ غالب مایوس ہو کر دہلی چلے آئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ نواب کی تقسیم کے خلاف کلکتہ میں اپیل کی جائے۔ حالی نے لکھا ہے کہ دہلی کے ریذیڈنٹ نے انھیں یہ امید دلائی تھی کہ ان کی یہ اپیل منظور ہو جائے گی۔ اسی امید پر وہ کلکتہ کے سفر کے لئے گھر سے روانہ ہوئے۔

کلکتہ کا سفر

ان کا یہ سفر کئی لحاظ سے ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ لکھنؤ پہنچے۔ اور کافی عرصہ تک وہاں ٹھہرے رہے۔

'غالب نامہ' کے مصنف کا خیال ہے کہ وہ تقریباً گیارہ مہینے لکھنؤ میں مقیم رہے یہ وہ زمانہ ہے جب غازی الدین حیدر کو لارڈ ہسٹنگز کے ایما پر بادشاہ کا خطاب اختیار کرکے نواب وزیر اودھ کی بجائے شاہِ اودھ بنے ہوئے آٹھ دس برس گزر چکے تھے۔ جب مرزا لکھنؤ پہنچے تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے لئے نایب السلطنت کی مدد کی ضرورت تھی۔ مرزا غالب نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے صنعتِ تعطیل میں مرجبہ نثر لکھی لیکن اس نثر کو پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نایب السلطنت نے ملاقات کے لئے جو شرطیں پیش کیں انھیں مرزا کی خودداری طبیعت قبول نہ کر سکی۔

غالب لکھنؤ سے ۲۷ جون ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ مرزا نے وہی قصیدہ جو باپ کی شان میں لکھا تھا ناموں میں تبدیلی کرکے سات آٹھ سال بعد بیٹے کے حضور میں پیش کر دیا۔ اس زمانے میں نواب روشن الدولہ نایب السلطنت تھے۔ نصیر الدین حیدر نے حکم دیا کہ غالب کو صلہ میں پانچ ہزار روپیہ بھیجا جائے۔ لیکن مشہور شاعر ناسخ راوی ہیں کہ اس پانچ ہزار میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھا لئے اور دو ہزار منشی محمد حسن نے ہضم کر لئے (جن کی معرفت غالب نے یہ قصیدہ بادشاہ کے حضور میں بھیجا تھا) اس طرح بیچارے غالب کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی۔

لکھنؤ سے رخصت ہو کر غالب کانپور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے۔ کچھ روز وہاں ٹھہر کر الہ آباد کی راہ لی۔ الہ آباد سے بنارس پہنچے۔ یہاں پہنچ کر دہ

بیمار ہوگئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں طبیعت بحال ہوگئی۔ انھوں نے اپنی مثنوی میں بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنارس انھیں بہت پسند آیا۔ چنانچہ ایک خط میں (جو اس سفر کے چالیس برس بعد لکھا گیا) فرماتے ہیں کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا۔ بنارس سے پٹنہ اور پٹنہ سے مرشد آباد ہوتے ہوئے ۲۱ر فروری ۱۸۲۸ء کو غالب کلکتے پہنچے۔

وہ تقریباً دو سال تک کلکتے ٹھہرے رہے۔ لیکن پنشن کا قضیہ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ شروع شروع میں تو انھیں کامیابی کی بہت امید تھی کیونکہ انگریز افسروں نے ان کی کافی آؤ بھگت کی تھی۔ لیکن جب دو سال گزر گئے اور جس منزل کو پیشِ نظر رکھ کر گھر سے نکلے تھے اُس تک رسائی نہ ہوئی تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی۔ چنانچہ ان کے بعد کے خطوط اس تلخی سے لبریز ہیں۔ پنشن کا جھگڑا مرزا کے دہلی واپس آنے پر بھی چلتا رہا۔ لیکن آخری فیصلہ ان کے خلاف ہوا اور لارڈ ولیم بنٹنک نے لارڈ لیک کے ایک فارسی حکم نامہ کی بنا پر جس کی رُو سے نصراللہ خاں کے وارثوں کی پنشن دس ہزار روپیہ سالانہ کی بجائے پانچ ہزار روپیہ سالانہ کر دی گئی تھی۔ مرزا غالب کی اپیل نامنظور کر دی۔

اس وقت تک مرزا کے سر بہت قرضہ چڑھ چکا تھا اور بظاہر اس کے ادا ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ قرضخواہوں نے جب ان کی اپیل کا یہ حشر دیکھا تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ ان میں سے دو ساہوکاروں نے

اپنے روپیہ کو اس طرح ڈوبتے دیکھ کر دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور وہاں سے ڈگری بھی حاصل کر لی ۔ مرزا میں یہ مقدرت کہاں تھی کہ ڈگری کا روپیہ ادا کر سکتے ۔ عدالت کے لئے ایک ہی چارۂ کار تھا اور وہ یہ کہ انھیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے ۔ لیکن غالب کے اپنے قول کے مطابق اس زمانے میں مشہور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی کہ عدالت کا چپراسی ان کے گھر نہ جاتا اور جب تک کہ مدیون رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کر سکتے تھے ۔ مرزا بھی گھر بیٹھ رہے ۔

فریزر کا قتل

اس کے تھوڑے عرصہ بعد نواب شمس الدین خاں کو دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر فریزر کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا دی گئی ۔ فیروز پور جھرکا کی ریاست بھی (جو نواب کی جاگیر تھی) سرکار نے ضبط کر لی ۔ یہ فریزر صاحب غالب کے دوست تھے ۔ اور حکام نے ان کے قتل کے مقدمہ کی تفتیش کے سلسلہ میں غالب سے بھی مدد لی ۔ اسی تفتیش کے نتیجہ کے طور پر نواب شمس الدین خاں مجرم ٹھہرائے گئے اور انھیں پھانسی کی سزا ملی ۔ غالب اور نواب میں جو دشمنی تھی اسے سارا زمانہ جانتا تھا اس لئے عام لوگوں میں غالب کے خلاف بہت بدظنی پھیل گئی ۔ ان کا خیال تھا کہ نواب شمس الدین خاں بے گناہ تھے لیکن غالب نے ذاتی انتقام کی خاطر حکام کو ان کے خلاف بھڑکا کر انھیں پھانسی دلوا دی ۔

ریاست فیروز پور جھرکا کی ضبطی کے بعد مرزا کی پنشن جو انھیں اس ریاست سے ملتی تھی ۔ دہلی کلکٹری سے ماہوار ملنی شروع ہو تی ۔ مرزا نے اس موقع پر پھر ایک مفصل عرضی گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں نواب کی جائیداد سے پورا حق پانے کے لئے پیش کی ۔ لیکن یہ درخواست داخل دفتر کر دی گئی ۔ اس پر مرزا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے گورنمنٹ کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی ۔ لیکن اس عرضداشت کا جواب بھی نہ ملا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے ایک عرضداشت بہ زبانِ انگریزی ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں بھی ارسال کی ۔ لیکن یہ سب سعی بے سود ثابت ہوئی ۔ اور مرزا کو ساری عمر میں ایک مرتبہ بھی باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن نہ ملی ۔

غالب کو زندگی بھر مصیبتوں اور ناکامیوں ہی کا سامنا رہا ۔ لیکن آہستہ آہستہ مرزا ان مصیبتوں کے عادی ہو گئے ۔ اس کے علاوہ اب انھیں یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ میری مالی حالت کچھ بھی کر لوں شدھر نہیں سکتی ۔ اور انھوں نے اپنے ذرائع آمدنی بڑھانے کی فکر اور دوڑ دھوپ ترک کر دی ۔ چنانچہ جب ۱۸۴۲ء میں انھیں ٹامسن کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے بلایا گیا اور چیف سکریٹری یہ خیال کر کے ان کے استقبال کے لئے اپنی کوٹھی سے باہر نہ نکلا ۔ کہ مرزا لاکھ بڑے شاعر ہوں اس وقت تو ایک امیدوارِ ملازمت کی حیثیت سے ملنے آئے

ہیں۔ تو مرزا اسے اپنی ہتک قرار دے کر اس سے ملے بغیر گھر چلے آئے۔

اس زمانے میں مرزا کی شاعری میں بھی ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی انھوں نے عرصہ سے اُردو شاعری ترک کر رکھی تھی۔ ان دنوں دہلی میں جا بجا مشاعرے ہوتے تھے۔ مرزا ان سب میں تو نہ جاتے تھے البتہ بعض مشاعروں میں نواب زین العابدین خاں عارف کی خاطر چلے جاتے تھے۔ مگر وہاں بھی فارسی اشعار پڑھا کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۴۵ء میں انھوں نے گاہے گاہے اُردو غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں۔

غالبؔ جیل میں

اسی زمانے میں مرزا کو جیل جانا پڑا۔ ان کے قرضخواہ تو انھیں قید نہ کروا سکے۔ لیکن چوسر کے شوق نے انھیں زنداں میں پہنچا دیا۔ اس واقعہ کے متعلق ۵ جون ۱۸۴۷ء کے "احسن الاخبار" (بمبئی) سے یہ تفاصیل معلوم ہوئی ہیں:۔

"دہلی ۵ ارجمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززینِ شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالتِ فوجداری سے نواب صاحب بہادر کلاں نے

جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی سفارش بھی کام نہ آئی اور غالب کو جرمانہ اور قید کی سزا ہو گئی۔"

"احسن الاخبار" اپنی ۱۷ر جولائی ۱۸۴۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"مرزا اسداللہ خاں غالب پر جو مقدمہ چل رہا تھا اس کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دوسو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دوسو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو قید کی مدت میں اور چھ مہینے کا اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپیہ زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں اور سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظرِ ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالتِ فوجداری سے مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جُرم میں ایسی سخت

سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

رہائی

مرزا غالب کو تین مہینے کے بعد اس قید سے رہائی نصیب ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کالے خاں کی معرفت وہ دربارِ شاہی میں باریاب ہوئے اور بہادر شاہ کے مرید ہو گئے۔ دربار سے ان کا مستقل تعلق اس وقت قائم ہوا جب بہادر شاہ نے شاہانِ تیموری کی تاریخ لکھنے کا کام اُن کے سپرد کیا۔ اس سے پہلے دربار میں ان کی حیثیت محض اتنی ہی تھی کہ قصیدے اور نظمیں پڑھتے اور انعام اور خلعت پاتے تھے۔ مگر اب ان کا شمار باقاعدہ درباریوں میں ہونے لگا۔ بادشاہ نے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب دیا اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے علاوہ تاریخ نویسی کی خدمت کے عوض چھ سو روپیہ سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔

ولی عہد کی اُستادی

اسی سال یعنی ۱۸۵۰ء میں وہ چار سو روپیہ سالانہ تنخواہ پر ولی عہد شہزادہ فتح الملک کے اُستاد مقرر ہوئے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ دو ہی سال بعد ولی عہد کا انتقال ہو گیا۔ شاہانِ تیموری کی تاریخ یعنی "مہرِ نیم روز" بھی بہادر شاہ کو پسند نہ آئی کیونکہ مرزا کا طرزِ تحریر بہت مشکل اور ادق تھا اور بہادر شاہ کو نادر ترکیبیں اور پُر پیچ تشبیہیں

اور استعارات پسند نہ تھے۔ مرزا نے "مہر نیم روز" کا پہلا حصّہ مکمل کر لیا۔ اور ۱۸۵۵ء میں یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے چھپ بھی گئی لیکن مرزا کو دُوسرا حصّہ مرتّب کرنے کی زحمت نہ دی گئی۔ کیونکہ مرزا کی فارسی نثر ادبی اعتبار سے تو بے عیب ہے لیکن تاریخی لحاظ سے "مہرِنیم روز" کا درجہ بہت پست ہے۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد غالؔب کو نواب زین العابدین عارؔف کی موت کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ عارؔف غالؔب کی بیوی کے بھانجے تھے۔ اور بہت اچھے شاعر تھے۔ غالؔب کو ان سے بے اندازہ محبّت تھی۔ ان کے مرنے کا مرزا کو اس قدر صدمہ ہوا کہ کافی عرصہ ان کی زندگی واقعی تاریک رہی۔ غالؔب نے عارؔف کی وفات پر جو دردناک مرثیہ لکھا ہے اس کا شمار اُردو شاعری کے بہترین مرثیوں میں ہوتا ہے۔ ہم اسے تمام و کمال یہاں نقل کرتے ہیں۔ تاکہ عارؔف سے غالؔب کی محبّت اور اس کی موت پر ان کے دلی رنج کا اندازہ ہو سکے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھِسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دِن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دِن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دِن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دِن اور

تم ماہِ شبِ چہاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دِن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دِن اور

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دِن اور

عارف کے دو بیٹے تھے، حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ مرزا ان دونوں بچوں کو اپنے پاس لے آئے اور حقیقی اولاد سے زیادہ پیار محبت کے ساتھ ان کی پرورش کی۔

اُستادِ شاہ کی حیثیت میں

۱۸۵۵ء میں غالب بادشاہ کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اور اسی سال

دربارِ رام پور سے ان کا تعلق ہوا۔ نواب رام پور بعد اِن سے اپنے شعروں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ انھوں نے غدر کے بعد غالب کی بہت مدد کی اور سچ پوچھو تو ان ہی کی دستگیری تھی کہ غالب غدر کے بعد بھی وضعدار زندگی بسر کرتے رہے ورنہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے اچھے اچھے متموّل اور امیر گھرانے فاقہ کشی اور دریوزہ گری پر مجبور ہو گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کا غدر

۱۸۵۷ء میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا جس نے ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر ایک امٹ نقش چھوڑا ہے۔ غدر نے غالب کی شاعری پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ وہ ایک حسّاس شاعر تھے۔ اس لئے غدر کے حالات سے ان کا متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ انھوں نے غدر میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ قید و بند سے تو وہ محفوظ رہے۔ لیکن زرِ پریشانیوں اور دوستوں اور عزیزوں کی موت اور صعوبتوں کے صدموں سے نہ بچ سکے۔ گرفتار تو انھیں بھی کیا گیا تھا لیکن بات زیادہ نہ بڑھنے پائی اور بہت جلد رہائی نصیب ہوگئی چنانچہ نواب غلام حسین خاں نے غدر کے جو حالات لکھے ہیں ان میں مرزا کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

> "مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کرکے لے گئے۔ اور کرنیل براؤن صاحب کے سامنے لے جاکر ان کو پیش کیا مگر مرزا صاحب کی

قسمت میں ابھی کچھ عرصہ زندہ رہنا تھا۔ ان کے ایک دوست
اتفاق سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان کی سفارش
کرکے رہائی دلوا دی۔"

غالب کے بھائی مرزا یوسف نے اسی ہنگامہ میں وفات پائی۔ غالب کو ان کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ مرزا کے دوستوں پر بھی غدر کے دوران میں اور اس کے بعد بڑی بڑی مصیبتیں آئیں۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب امین الدین خاں اپنی جاگیر لوہارو کو جا رہے تھے کہ مہرولی کے قریب گٹیروں نے انھیں آگھیرا اور بدن کے کپڑوں کے سوا اور سب کچھ لے گئے۔ دہلی میں ان کے گھر پر جو آفت آئی وہ اس سے کہیں زیادہ اندوہناک تھی۔ نواب ضیاء الدین کا گھر جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ نواب صاحب کے پاس مرزا غالب کا بہت سا کلام جمع تھا وہ بھی اسی آگ میں تباہ ہو گیا۔ چنانچہ مرزا غدر کے بعد اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

" بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب
ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودے مجھ سے لے کر اپنے پاس
جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ
کتاب رہی نہ اسباب رہا۔"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالب کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ انھیں غدر کے بعد سات سال قید کا حکم ہوا تھا مگر انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی جو منظور ہوئی اور وہ رہا کر دیئے گئے۔ مولانا مفتی صدرالدین

آزردہ پر جو بیتی اس کا حال خود غالب کی زبان سے سنیے :۔

"حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دیر حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔"

مولانا فضل حق خیر آبادی کا انجام سب سے افسوسناک ہوا۔ یہ غالب کے نہایت قابل اور مہربان دوستوں میں سے تھے۔ اور ان کا غالب پر اور ان سے کہیں زیادہ اُردو ادب اور اُردو زبان پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے غالب کو بیدل کی تقلید سے روکا اور صحیح راستے پر ڈالا۔ ان کی نسبت غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"مولانا کا کچھ حال تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ تم مجھ سے معلوم کرو اپیل میں حکم دوامِ حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ ۔ ۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہولیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

مولانا فضل حق کو دہلی سے رنگون جلاوطن کیا گیا تھا۔ غالب ان کی یاد میں تڑپتے رہے۔ اکتوبر ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں منشی داد خاں سیاح

کو لکھتے ہیں :۔

"ہاں خاں صاحب آپ جو کلکتہ پہنچے ۔ اور سب صاحبوں سے ملے ہو ۔ تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو ۔ کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی ۔ اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے ۔ کس طرح گزارہ ہوتا ہے ۔"

دلّی کی تباہی

غدر کے بعد دلّی میں جو تباہی مچی ۔ یہاں اس کا تذکرہ ضروری معلوم نہیں ہوتا ۔ غالب کے حسّاس دل پر شاہ جہاں آباد کی اس بربادی کا جو اثر ہوا وہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا ۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے ۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے ۔ . . . قصّہ مختصر شہر صحرا ہو گیا ۔ اور اب جو کنوئیں جاتے رہے ۔ اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا ۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں ۔ واہ رے حسنِ اعتقاد ۔ بندۂ خدا ۔ اُردو بازار نہ رہا ۔ اُردو کہاں ۔ دلّی کہاں ۔ واللہ اب شہر نہیں ہے ۔

کمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ ایک اور خط میں لکھا ہے :۔

"بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں۔ دلّی کی ہستی کئی ہنگاموں پر منحصر ہے۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلّی کہاں ؟"

آخر عمر اور وفات

غالب غدر کے بعد صرف دس برس اور جئے۔ آخر عمر میں وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ انھیں اپنی موت کا اس قدر شدید انتظار تھا کہ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے۔ حالی لکھتے ہیں :۔

"مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہوتا۔ پھر بے ہوش ہو جاتے۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاء الدین خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔

فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دُوسرا مصرع یہ تھا۔ع

نہ کرد ہجر مدارا بہ من سرِ تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے "

مرزا غالب نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو تہتر برس کی عمر میں وفات پائی اور حضرت سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ میں دفن کیے گئے۔

غالب کی اُردو تصنیفات میں 'دیوانِ غالب'۔ 'عودِ ہندی'۔ 'اُردوئے معلّٰی' اور فارسی میں 'کلیاتِ غالب'۔ 'پنج آہنگ'۔ 'قاطع برہان' 'نامۂ غالب'، 'مہرِ نیم روز'۔ 'دستنبو' اور 'سبدِ چین' بہت مشہور اور قابلِ قدر کتابیں ہیں۔

ان کے شاگرد بے شمار تھے۔ لیکن مولانا الطاف حسین حالی، میر مہدی مجروح، مرزا قربان علی بیگ سالک، مرزا حاتم علی مہر، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، اور منشی ہرگوپال تفتہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نامور اُستاد کے ان قابلِ فخر شاگردوں نے نظم و نثر کے میدان میں اپنی اُستادی اور قادر الکلامی کا سکہ جما دیا۔

کمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ ایک اور خط میں لکھا ہے :۔

"بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں۔ دلّی کی ہستی کئی ہنگاموں پر منحصر ہے۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلّی کہاں ؟"

آخر عمر اور وفات

غالبؔ غدر کے بعد صرف دس برس اور جئے۔ آخر عمر میں وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ انھیں اپنی موت کا اس قدر شدید انتظار تھا کہ ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے۔ حالیؔ لکھتے ہیں :۔

"مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پھر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہوتا۔ پھر بے ہوش ہو جاتے۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاؤ الدین خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا لکھوایا۔

فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دُوسرا مصرع یہ تھا۔ع

نہ کرد ہجر مدارا بہ من سرِ تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے "

مرزا غالبؔ نے ۱۵ فروری ۱۸۶۸ء کو تہتر برس کی عمر میں وفات پائی اور حضرت سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ میں دفن کیے گئے۔

غالبؔ کی اُردو تصنیفات میں 'دیوانِ غالب'۔ 'عودِ ہندی' ۔ 'اُردوئے معلّٰی' اور فارسی میں 'کلّیاتِ غالب'۔ 'پنج آہنگ'۔ 'قاطع برہان' 'نامۂ غالبؔ'، 'مہر نیم روز'۔ 'دستنبو' اور 'سبدِ چین' بہت مشہور اور قابلِ قدر کتابیں ہیں۔

ان کے شاگرد بے شمار تھے۔ لیکن مولانا الطاف حسینؒ حالیؔ، میر مہدی مجروحؔ، مرزا قربان علی بیگ سالکؔ، مرزا حاتم علی مہرؔ، نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ، اور منشی ہرگوپال تفتہؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نامور اُستاد کے ان قابلِ فخر شاگردوں نے نظم و نثر کے میدان میں اپنی اُستادی اور قادر الکلامی کا سکہ جما دیا۔

اخلاق و عادات

مرزا[۵۱] کے اخلاق و عادات کی جو تصویر حالی نے "یادگارِ غالب" میں کھینچی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر اس قدر مکمل ہے کہ اس میں مزید اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے۔ اور غالب کی شہرت کی بنیاد شاید "دیوانِ غالب" سے بھی زیادہ مولانا حالی کے اس شاہکار پر ہے۔ لیکن جیسا کہ حالی نے "حیاتِ جاوید" کے دیباچہ میں لکھا ہے یہ تصویر یک طرفی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے صرف مرزا کے "کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔" مرزا کی ذہنی اور دماغی خوبیوں سے ان کی شگفتہ طبعی، ذہانت، آزادخیالی اور محققانہ نظر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ . . . . اس کے علاوہ وہ پرلے درجے کے وضعدار تھے۔ اور گو انھیں صحیح نوابی شان کبھی میسر نہ ہوئی مگر ان سے جہاں تک ہو سکا انھوں نے جاگیرداروں کی تمام وضعداریاں نبھائیں۔ دوستوں کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ اور جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے ان کی مصیبتوں اور بدحالی سے متاثر ہو جاتے۔ حسنِ اخلاق اور لحاظ و مروّت میں وہ عہدِ مغلیہ کے شرفا کا ایک اچھا نمونہ تھے۔ لیکن مرزا آخر انسان تھے۔ فرشتہ نہیں تھے۔

---

[۵۱] "غالب نامہ"

ان کا دل غصّے سے، رنج سے، رشک سے اور اسی قسم کے دُوسرے تمام انسانی جذبات سے متاثر ہوتا۔ بعض وقت وہ طیش میں اپنے مخالفین کی نسبت ایسے سخت فقرے لکھ جاتے کہ انھیں دُہرانے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ حالی لکھتے ہیں " غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ہوگئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غالب کا ایک وصف یہ تھا کہ انھوں نے عوام کی تقلید کا ڈھنگ کبھی گوارا نہیں کیا۔ جس طرح شاعری میں انھوں نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور اپنے پیش رو اور ہم عصر اردو شاعروں سے بالکل مختلف رنگ اختیار کیا اسی طرح اپنی نجی زندگی میں بھی انھوں نے ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھا کہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی ان میں اور عام لوگوں میں مماثلت اور مشابہت نہ پیدا ہو۔ اس سلسلہ میں ان کے خطوط میں بعض دلچسپ لطائف ملتے ہیں۔ ابتدا میں وہ سر نہیں منڈاتے تھے۔ صرف ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ داڑھی منڈانا ایک عام فیشن ہوگیا ہے۔ اور سبھی لوگ داڑھی منڈانے لگے ہیں۔ تو انھوں نے داڑھی بڑھالی اور سر کے بال منڈانے شروع کر دئے۔ جب دوستوں نے پوچھا کہ حضرت آپ نے یہ کیا کیا؟ تو فرمانے لگے کہ ہرایرا غیرا نتھو خیرا ڈاڑھی منڈاتا ہے۔ غالب میں اور عام لوگوں میں کوئی چیز تو مابہ الامتیاز ہونی چاہئے۔ اسی طرح ایک اور لطیفہ ہے کہ ایک زمانے میں

انھیں اپنی موت کا بہت شوق اور بہت انتظار تھا۔ ہر سال اپنی وفات کی تاریخیں نکالا کرتے۔ مگر موت کو تو اپنے وقت پر ہی آنا تھا۔ اسے غالبؔ کے شوق یا انتظار کی کیا پروا تھی۔ اس لئے مرزا کی تاریخیں ہر سال بیکار جاتیں۔ ایک سال انھوں نے اپنی تاریخِ وفات نکالی اور دوستوں سے کہا کہ یہ غلط ثابت نہیں ہوگی۔ اس دفعہ میں ضرور مر جاؤں گا۔ اتفاق کی بات کہ اس سال دہلی میں زبردست وبا پھیلی اور سینکڑوں لوگ لقمۂ اجل ہوگئے مگر مرزا ایسے سخت جان نکلے کہ اس وبا میں بھی بچ نکلے۔ یار دوستوں نے کہا کہیجئے اب کے بھی آپ کا قیانہ غلط نکلا۔ فرمانے لگے۔ یہ بات نہیں ہے۔ میری موت تو اسی برس [illegible]ں تھی۔ مگر میں نے جب یہ دیکھا کہ وبا میں ہر کہ ومہ مر رہا ہے تو اس سال مرنے کا ارادہ ترک کر دیا

اِستغنا اور بے نیازی

غالبؔ کی طبیعت کا ایک خاص جوہر ان کا استغنا تھا۔ ان کی طبیعت ہمیشہ امیرانہ رہی۔ اپنی عمر کے آخری حصّے میں ان کا ہاتھ بہت تنگ رہا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیا۔ اپنے لواحقین اور دوست احباب سے جو سلوک اچھے دِنوں میں کیا کرتے تھے وہی اس دَور میں بھی جاری رکھا۔ پُرانے مشرقی شعراء پر ایک عام الزام یہ ہے کہ وہ حریص اور لالچی ہوتے تھے۔ غالبؔ پر یہ الزام لگانا انصاف کا خون کرنا ہوگا۔ وہ بالکل ہی فقیر منش اور قلندر تو نہیں تھے لیکن حرص اور

لالچ کے بندے بھی نہ تھے۔

بعض نقادوں نے ان کے قصیدوں پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ان میں غالب نے بہادر شاہ ظفر۔ نواب رام پور اور اپنے انگریز ممدوحین کی ناجائز خوشامد اور کاسہ لیسی کی ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ غالب ایک سپاہی پیشہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ گھر اور ننھیال دونوں خوش حال۔ اگر انھوں نے شعر کہنا شروع کیا تو اس لئے نہیں کہ وہ درباری شاعر بن کر اپنی معاش کی طرف سے بے فکر ہونا چاہتے تھے۔ طبیعت کی موزونی نے انھیں اس راہ پر ڈالا۔ ورنہ وہ تو عمر بھر پیشۂ آبا پر فخر کرتے اور یہ کہتے رہے کہ ؎

سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں بہادر شاہ کے دربار سے باقاعدہ وابستہ ہوئے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب ان کی مالی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ انھیں دنوں انھوں نے بعض ایسے خطوط اور قصیدے لکھے جن کی بنا پر ان پر حرص، لالچ اور خوشامد کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس قسم کے نکتہ چین عام طور پر غالب اور بیدل کے موازنہ اور مقابلہ پر بہت زور دیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں غالب پر بیدل کا بہت اثر تھا۔ اور شروع شروع میں تو ان کا کلام محض کلام بیدل کا چربہ تھا۔ غالب کے نکتہ چین یہ کہتے ہیں کہ بیدل استغنا اور

بے نیازی کی مجسّم تصویر تھا۔ غالب کا اس سے کیا مقابلہ ؟ غالب شہرت اور دولت دونوں کے بھوکے ہیں۔ نورالحسن ہاشمی اپنی کتاب میں غالب کے متعلق لکھتے ہیں "ہندوستان کے کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ سب لوگ اسی طرح ان کو مانتے ہیں مگر ان کی رُوح خوش نہیں ہوتی اور وہ خوش نہ ہوں گے جب تک کہ انہیں ملکہ وکٹوریا اپنا درباری خاص شاعر نہ بنالیں۔ اور اگر غدر کی وجہ سے ان کی یہ سکیم ناکام ہو جائے تو ہر ایک کی مدح دستایش اور قدردانی کو ناکافی سمجھ کر خود اپنی تعریف کرنے پر اُتر آئیں گے۔ . . . اور اپنی اس قدر افزائی کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں کرتے اور کیا کیا جوڑ توڑ نہیں لگاتے۔ تقریباً ہر ریزیڈنٹ اور ہر گورنر جنرل کی تعریف میں قصیدہ لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکرٹری یا اور کسی انگریز عہدہ دار سے دوستی ہو جاتی ہے. تو اس کی مدح کرنے میں بند نہیں رہتے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہاں جوڑ توڑ لگا کر پہنچ جاتے ہیں۔ رام پور کے یہاں الگ سکہ جمائے ہیں۔ بادشاہِ اودھ کے یہاں الگ زور لگاتے ہیں۔ حیدرآباد دکن الگ قصیدے بھیجتے ہیں۔ لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملنے پر خاموش رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام ہند کے نوابوں اور بادشاہوں پر ان کی حوصلہ مندی مطمئن اور مجبور ہو جانا پسند نہیں کرتی اور جب تک یہ ملکہ وکٹوریا کے خاص شاعر مقرر نہ ہو جائیں، انھیں چین نہیں آسکتا"

غالب اور بیدل کے موازنہ سے پہلے ہم سے کچھ اُردو قصیدے کے متعلق سُن لیجئے۔ اسی ضمن میں مرزا غالب کے قصیدوں پر بھی بحث

ہو جائے گی ۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ غالب نے قصیدہ گوئی کیوں اختیار کی ؟ اس کے قصیدوں اور اُردو کے دُوسرے شعرا کے قصیدوں میں کیا فرق ہے ؟ اور اس پر خوشامد ۔ حرص اور لالچ کے الزامات کہاں تک درست ہیں ؟ ان باتوں کے معلوم ہو جانے کے بعد بیدل اور غالب کا موازنہ آسانی سے ہو سکے گا ۔

مشرقی ادب کی مشرق کے بیشتر ممالک میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ بادشاہوں اور سلاطین کے درباروں میں پلا اور پروان چڑھا ۔ عربی ادب میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے اور فارسی ادب میں بھی ۔ اور اُردو ادب نے تو آنکھ ہی مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں کھولی ۔ اب چاہے اسے بُرا سمجھئے یا اچھا لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا بادشاہوں اور سلاطین کی مدح و ستایش سے ہوئی ۔ پُرانی اُردو شاعری پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں قصیدہ گوئی کی ابتدا بہت پہلے سے ہو چکی تھی ۔ دکنی وکنی کو اُردو شاعری کا باوا آدم بتایا جاتا ہے ۔ اس کے کلام میں بھی آپ کو کئی قصیدے ایسے ملیں گے جو اس نے اپنے زمانے کے دکنی سلطانوں کی تعریف میں کہے ہیں ۔ بات در اصل یہ تھی کہ ہمارے پُرانے شعرا کی معاش کا انحصار زیادہ تر اپنے ممدوح بادشاہوں کی قدردانی اور داد و دہش پر ہوتا تھا ۔ لیکن اگر صرف اسی ایک چیز کو اُردو قصیدہ گوئی کی وجہ قرار دے دیا جائے تو یہ بے انصافی ہوگی ۔ پُرانے بادشاہ صرف

علم اور ادب کے قدردان ہی نہ تھے، بلکہ وہ خود بھی اس میدان کے شہسوار تھے۔ اور ان میں ایسی ایسی خوبیاں پائی جاتی تھیں کہ وہ ہر طرح تعریف کے مستحق تھے۔ اس لئے اول اول جب شعرا نے اس قسم کے بادشاہوں اور سلاطین کی مدح میں قصیدے لکھے تو اس لئے نہیں کہ وہ ان کی خوشامد کرنا چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ (خواہ اسے موجودہ زمانہ میں مضحکہ خیز ہی کیوں نہ سمجھا جائے) سچ مچ انھیں قابلِ ستایش سمجھتے تھے۔ گو ویسے مبالغہ شاعری کی خاص صفت ہے۔ (۳۱) کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا قصیدہ گوئی ایک رسم کی صورت اختیار کر گئی۔ ممدوح چاہے تعریف کا مستحق ہو یا نہ ہو شاعروں کے لئے اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا ضروری ٹھہرا۔ اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ درباری شاعروں اور پیشہ ور بھانڈوں میں کوئی فرق ہی نہ رہا۔

غالب کے زمانے میں بدقسمتی سے مسلمانوں کی سلطنت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اور ان کے دیکھتے دیکھتے اس نے دم توڑا آخری مغل بادشاہ صرف امور سلطنت کے لحاظ سے ناکارہ نہیں تھے بلکہ علم و ادب کے میدان میں بھی ان میں اور ان کے نامور آبا و اجداد میں کوئی نسبت نہیں تھی۔ شاہانِ دہلی کے علاوہ دوسرے چھوٹے چھوٹے نوابوں اور خود مختار سلاطین کا بھی یہی حال تھا لیکن اس کے باوجود غالب کو بھی اپنے اردو شاعروں کی طرح مغل بادشاہ چھوٹے چھوٹے نوابوں۔ انگریز گورنر جنرلوں اور ریزیڈنٹوں کی شان میں قصیدے

لکھنے پڑے ۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ ہر چند غالب اپنے زمانے کے عام اُردو شعرا سے بہت بلند تھے ۔ اور ان کی طبیعت میں بعض ایسی باتیں بھی پائی جاتی تھیں جو انھیں دُوسروں سے ممتاز کرتی تھیں ۔ لیکن اس کے باوجود قصیدہ گوئی کی رسم کو نبھانا ان کے لئے بھی ضروری تھا ۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر خود بھی شاعر تھا اور ایک اچھا شاعر ۔ اپنی بساط کے موافق اس نے ذوق اور غالب کی قدر افزائی بھی کی ۔ اس کے علاوہ غالب اس کے مرید بھی تھے ۔ اس لئے بہادر شاہ کی شان میں ان کے قصیدے اپنی تمام مبالغہ آرائیوں کے باوجود کچھ بہت زیادہ بے جا نہیں معلوم ہوتے ۔ انگریز گورنر جنرلوں اور ریزیڈنٹوں کی مدح سرائی کی وجہ مرزا کی بعض ذاتی مصلحتیں تھیں ۔ اپنی پنشن کے جھگڑے کے سلسلہ میں وہ ان لوگوں کی خوشامد پر مجبور تھے ۔ بہادر شاہ کی شان میں لکھے ہوئے قصیدوں میں خلوص کی تھوڑی بہت جھلک نظر آتی ہے لیکن ان انگریز افسروں کی شان میں انھوں نے جو قصیدے لکھے ہیں وہ سراسر تصنع اور بناوٹ سے پُر ہیں ۔

قصائد میں بھی امتیازی شان

لیکن غالب کی قصیدہ گوئی بھی اپنے اندر ایک خاص شان لئے ہوئے ہے ۔ عام اُردو شعرا کے مقابلے پر انھوں نے قصائد بہت کم

کہے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں بہت کم قصیدے ملتے ہیں اور وہ بھی بہت چھوٹے چھوٹے لیکن جو چیز پیش کی ہے وہ بہت بلند ہے۔ غالب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ تعریف کرتے وقت یہ نہیں بھولتے کہ وہ کس کی تعریف کر رہے ہیں۔ اکثر اُردو شعرا کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے ممدوح کی تعریف میں اپنی اور ممدوح دونوں کی شخصیت کو بھول جاتے تھے۔ غالب میں یہ کمزوری نہیں پائی جاتی ایک اور بات جو غالب کے درجہ کو اُردو کے دُوسرے قصیدہ گو شاعروں سے بلند کرتی ہے یہ ہے کہ وہ ممدوح سے سوال کرتے وقت بھی اپنی خودداری اور بانکپن کو نہیں چھوڑتے۔ مدح سرائی وہ بھی کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی وضعداری پر بھی حرف نہیں آنے دیتے۔ ممدوح سے صلہ مانگتے ہیں۔ لیکن اپنی گردن میں ذلت کا خم نہیں آنے دیتے۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی شانِ نزول یہ تھی کہ شاہی دربار سے غالب کو تنخواہ ہر مہینے کی بجائے پُوری ایک ششماہی گزر جانے پر ملتی تھی۔ اور مرزا کے یہ دن بڑی مشکل سے کٹتے تھے۔ جب اُدھار پر گزر کرتے کرتے تنگ آگئے تو بادشاہ کے حضور میں یہ قصیدہ پیش کیا۔ اور یہ درخواست کی کہ میری تنخواہ مجھے ہر ماہ عطا کی جائے۔ لیکن درخواست کے انداز میں بھی اپنے بانکپن کو نہ چھوڑا ہے

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گو و خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کا اظہار کیا ہے لیکن ایک ایسے پیرائے میں کہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ غالب ایک عام خوشامدی کی طرح لال قلعہ میں دستِ سوال دراز کئے کھڑا ہے ؎

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

اب عرضِ مدّعا سُنئے ؎

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

اپنی مجبوریوں کے اظہار کے بعد بادشاہ کے حضور میں اپنی درخواست پیش کرتے ہیں لیکن کن الفاظ میں ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حمید احمد خاں صاحب لکھتے ہیں کہ " بعض لوگ جو غالب کی آخر عمر کی قصیدہ خوانیوں کو ضروری اہمیت دینے کے خوگر ہیں۔ یہ سمجھنے میں دِقت محسوس کرتے ہیں۔ کہ بیدؔل جیسے قناعت شعار اور مستغنی المزاج انسان کے ساتھ اسے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس طرزِ خیال کے لوگوں کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ بیدؔل عہدِ اورنگ زیب کا شاعر ہے۔ ہندوستان اُس وقت تک " گولڈن انڈیا " کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ کا ہندوستان بڑی حد تک مفلس ہندوستان تھا۔ حال ہی میں " مکاتیبِ غالبؔ " کا جو نسخہ رام پور سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مندرجہ خطوط میں سے بعض غالبؔ کے بڑھاپے کی مالی پریشانیوں پر درد ناک روشنی ڈالتے ہیں۔ غالبؔ کا افلاس اور بڑھاپا انتہائی تکلیف تک پہنچ گیا ہے۔ اور اسے پچاس پچاس روپے کی حقیر رقموں کے لئے نواب صاحب رام پور کو جس عجز و ابرام کے ساتھ خط لکھنے پڑتے ہیں وہ بے حد عبرت انگیز ہے۔ اس کے مقابلے میں بیدؔل کا ماحول دولت و ثروت سے مالا مال تھا۔ تمام بڑے بڑے امرا اس کے دروازے پر آنا اور اس کی خدمت میں تحائف پیش کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ مجموعۂ رام پور کے بعض مکاتیب پر غور کیجئے اور

اس کے ساتھ محمد حسین آزاد کی زبان سے بیدل کی زندگی کا یہ واقعہ سُنئے :-

ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے لایا۔ اتفاقاً سب انار اس کے گل گئے۔ حیران ہو کر چند انار جو باقی تھے بہ طریق نذر مرزا (بیدل) کے پاس لایا اور عرضِ حال کیا۔ مرزا نے ایک شعر اسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بخیۂ کفشم اگر دنداں نما شد عیب نیست
خندہ دارد چرخ ہم بر ہرزہ گردی ہائے من

نواب اسے حسنِ طلب سمجھے کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت غنیمت سمجھے۔ اسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ مرزا نے کل روپیہ اُسی کابلی کو دے دیا جس شخص کے حالات یہ ہوں اس کی زندگی کی بنیاد اگر استغنا پر قائم رہی تو کیا عجب ہے !

غالب کو ویسے قدردان نہ مل سکے۔ جیسے خوبیٔ قسمت سے بیدل کو میسّر آئے۔ بیدل دائیں ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ غالب کو اس قسم کی فیاضانہ داد و دہش کی حسرت ہی رہی۔

لیکن قسمت کی ان تمام کوتاہیوں اور ایک ہلکے سے فرقِ سیرت کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بیدل اور غالب استغنا کے معاملے میں بہ حیثیتِ مجموعی یکساں تھے۔ اگر بیدل نے شاہزادہ محمد اعظم

کی ملازمت کو ایک اصول کی خاطر ٹھکرا دیا۔ تو غالب نے بھی حکومتِ ہند کے چیف سکرٹری مسٹر ٹامسن کی پیشکش کو اپنی آن پر قربان کر دیا۔ اور جب کعبۂ حکومت کا دروازہ اس کے لئے وا نہ ہوا تو وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ جو لوگ مکاتیبِ رام پور سے غالب کی طبیعت کا اندازہ کرنا چاہیں۔ وہ اس واقعے کو بھی نظرانداز نہ کریں جو کلکتہ جاتے ہوئے اسے لکھنؤ میں نائب السلطنت اودھ کی ملاقات کے سلسلہ میں پیش آیا۔ نائب السلطنت آمادۂ لطف و کرم تھا۔ مگر آدابِ ملاقات کے سلسلہ میں جو شرطیں اس نے لگائیں انھیں غالب کی خودداری قبول نہ کر سکی۔ چنانچہ مسٹر ٹامسن کی طرح غالب نے اس سے بھی ملاقات نہ کی۔

ظرافت اور شوخیٔ طبع

غالب کے استغنا اور خودداری کو دیکھتے ہوئے گمان ہو سکتا ہے کہ خشک مزاج اور تند خو ہوں گے۔ لیکن خشونت اور تندخوئی کجا غالب کے مزاج میں تو اس قدر ظرافت اور شوخی تھی کہ لطیفہ گوئی اور فقرہ چست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور اس بلا کے حاضر جواب تھے کہ سُننے والوں کو اپنی بذلہ سنجی سے تڑپا دیتے تھے۔ چنانچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اگر مرزا کی بذلہ سنجی اور شوخ گفتاری کے تمام شہپاروں کو یکجا کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب

تیار ہو جائے۔ ذیل میں ان میں سے صرف چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں :-

ایک دفعہ مرزا لکھنؤ میں تھے۔ کسی محفل میں دلی اور لکھنؤ کی بولی کے فرق پر گفتگو چھڑ گئی۔ ایک صاحب نے مرزا سے پوچھا کہ جس موقع پر اہلِ دہلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں اہلِ لکھنؤ اس موقع پر "آپ کو" بولتے ہیں۔ آپ کی رائے میں کونسی ترکیب زیادہ فصیح ہے۔ مرزا نے جواب دیا "فصیح تو یہی ہے جو اہلِ لکھنؤ بولتے ہیں لیکن اس میں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں "آپ کو" فرشتہ خصلت سمجھتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو "آپ کو" کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں تو مشکل یہ پیش آئے گی کہ میں تو اپنے متعلق کہوں گا لیکن آپ شاید اپنی نسبت سمجھ لیں گے۔" حاضرین مرزا کی اس حاضر جوابی پر پھڑک اٹھے۔

دہلی میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پکڑ دھکڑ ہوئی تو کچھ گورے مرزا کو بھی پکڑ کر لے گئے۔ کسی کرنیل کے سامنے پیش کئے گئے اس نے پوچھا "وَل تم مسلمان ہو؟" مرزا نے جواب دیا "آدھا" کرنیل نے پوچھا "اس کا مطلب؟" مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں، سُوّر نہیں کھاتا۔" کرنیل بے اختیار ہنس پڑا اور مرزا کو چھوڑ دیا۔

مرزا رام پور میں تھے۔ نواب صاحب لفٹنٹ گورنر سے

ملاقات کے لئے بریلی جانے لگے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے کہا "خدا کے سپرد" مرزا فوراً بولے "حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا۔ آپ پھر اُلٹا کر مجھے خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔"

ایک محفل میں مرزا میر تقی کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ذوق بھی وہاں موجود تھے۔ کہنے لگے "میں تو سودا کو میر پر ترجیح دیتا ہوں" مرزا نے کہا۔ "میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ تو سودائی ہیں۔"

حکیم رضی الدین مرزا کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کو آم نہ بھاتے تھے جب کہ یہ پھل مرزا کا من بھاتا کھاجا تھا۔ ایک دن وہ مرزا کے پاس بیٹھے تھے کہ سامنے سے گدھے گزرے۔ اتفاق سے گلی میں آموں کے چھلکے پڑے تھے گدھے نے ان پر منہ ڈالا مگر صرف سونگھ کے چھوڑ دیئے۔ حکیم رضی الدین نے مرزا کے چٹکی لینے کی غرض سے کہا۔ "دیکھا مرزا صاحب۔ آم کو گدھے بھی نہیں کھاتے۔" مرزا کب چوکنے والے تھے۔ فوراً جواب دیا۔ "جی ہاں۔ گدھے آم نہیں کھاتے۔"

ایک دفعہ رمضان کے مہینے میں سخت گرمی پڑ رہی تھی اور لُو چل رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا مرزا ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جو اندھیری بھی تھی ایک دوست کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے مولانا آزردہ آن نکلے۔ مرزا کو رمضان کے مہینے میں شطرنج کھیلتے دیکھکر

مولانا نے چوٹ کی۔ "مذہبی کتابوں میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اس کی صحت میں تردد ہونے لگا۔" مرزا بولے۔ "حضرت آپ درست فرماتے ہیں وہ کوٹھڑی جس میں شیطان مقید رہتا ہے یہی تو ہے۔"

مرزا کے مزاج میں ظرافت اور شوخی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ شاگرد حتیٰ کہ شریکِ زندگی بھی اس کی زد سے نہ بچیں۔ ایک روز آپ کے شاگردِ رشید میر مہدی مجروح پاس بیٹھے تھے۔ مرزا ٹانگوں میں درد کی وجہ سے کراہنے لگے تو انھوں نے پاؤں دبانے شروع کر دئے۔ مرزا نے کہا۔ "بھئی تو سید زادہ ہے۔ کیوں مجھے گنہ گار بناتا ہے۔" مگر مجروح نہ مانے۔ کہنے لگے۔ "اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو اجرت دے دیجئے گا۔" مرزا نے کہا۔ "اچھا تو اب مضائقہ نہیں۔" جب وہ پاؤں دبا چکے تو حسب معاملہ اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا۔ "بھیا۔ اُجرت کیسی۔ تم نے میرے پاؤں دبائے میں نے تمھارے پیسے دبائے۔ حساب برابر ہوگیا۔"

اسی طرح ایک دِن مولانا حالی جو آپ کے تلامذہ میں سے تھے شام کے وقت مرزا کے پاس بیٹھے تھے آپ کھانا کھا رہے تھے مولانا مکھیاں جھل رہے تھے۔ مرزا نے فقرہ چُست کیا۔ "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں میں اِن کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔"

ایک مرتبہ کسی نے اپنے خط میں ایک شخص کی دُوسری بیوی کے

مر جانے کا ذکر کیا اور لکھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اب وہ تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے۔ مرزا نے جواب میں جو کچھ لکھا ظرافت کی جان ہے۔ فرماتے ہیں۔ "مجھے اس کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو دفعہ ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے!"

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان دیکھ کر آئے اس کا دیوان خانہ تو خود دیکھ آئے اندرونی حصہ نہ دیکھ سکے گھر آکر بیوی کو اندرونی حصہ دیکھنے کے لئے بھیجا اور جب دیکھ کر واپس آئیں تو پوچھا۔ پسند آیا یا نہیں۔ وہ کہنے لگیں "اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔" مرزا بولے "کیا دنیا میں تم سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے۔"

ایک دفعہ مرزا بارہ سو روپے کے مقروض ہو گئے۔ قرض خواہوں نے دعویٰ کیا۔ مفتی صدر الدین کی عدالت میں پیش ہوئے تو یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صدر الدین کو یہ شعر اس قدر پسند آیا کہ قرضہ کی رقم اپنی جیب سے ادا کر دی اور مرزا کو بری کر دیا۔

غزل گوئی میں غالب کا مرتبہ

غالب نے نثر و نظم کی جس صنف میں طبع آزمائی کی اُس میں جدّتِ طبع سے کام لیتے ہوئے نئی راہیں نکالیں مگر اصل میں غالب غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی ان کی جولانیٔ طبع کا حقیقی میدان ہے۔ میر تقی میر پہلے اُردو شاعر تھے جنھوں نے غزل کو جذباتِ عشق و محبت اور اس کی واردات اور تاثرات کے لئے مخصوص کیا ان سے لے کر غالب تک اُردو کے سب شعرا میر ہی کی لے میں غزل سرا رہے اور بڑے سے بڑے شاعر نے میر کی تقلید کو باعثِ فخر و ناز سمجھا۔ میر کی اس مقبولیت کا سبب دو چیزیں تھیں۔ سادگیٔ بیان اور سوزِ محبت مگر محبت کی ترجمانی کا پورا حق صرف سوز کی عکاسی سے ادا نہیں ہوتا۔ اس کے دُوسرے پہلو بھی ہیں۔

غالب گو میر کے معتقد اور ان کی اُستادی کے قائل تھے لیکن انھوں نے میر کی اندھی تقلید گوارا نہ کرتے ہوئے محبت کے بارے میں اپنے زاویۂ نگاہ کو وسیع کر لیا۔ غالب کی مقبولیت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے غزل کو میر کے سوز کے دائرے سے نکال کر نئے امکانات سے آشنا کر دیا اور محبت کی ترجمانی میں تنوّع پیدا کر کے

اس کو جذبات کی رنگا رنگی کا آئینہ دار بنا دیا۔ اس اعتبار سے غالبؔ اپنے سے پہلے اور بعد کے تمام غزل گو شعرا کے مقابلے میں ایک خاص امتیازی شان کے مالک نظر آتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو غزل میں ان کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی دُوسرے غزل گو شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے فن کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں گیا۔ غالبؔ کی غزلیات کا موضوع نہ دِل ہے نہ دماغ۔ بلکہ انھوں نے ان دونوں کے امتزاج سے اپنے شعر کا مزاج تیار کیا ہے۔ غالبؔ فن کار بھی ہے اور ایک بلند پایہ شاعر بھی۔ اس کی غزل گوئی کامیاب ترین شاعری ہے۔ اس میں فن بھی ہے اور جذبہ بھی۔ سوز بھی ہے اور ساز بھی۔

غزل کا سرمایہ جذب و مستی ہے۔ اور غالبؔ جذب و جوش کی تصویر کشی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں سوز و گداز ہے داغؔ رندی کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ غالبؔ نے بھی ارضی محبت ہی کی نغمہ سرائی کی ہے مگر نہ وہ رونے کے قائل ہیں نہ وہ اپنے دامن کو ہوس پرستی اور ہوس ناکی سے آلودہ ہونے دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ خود کو اہلِ نظر میں شمار کرتے ہیں کیونکہ ہوسناکوں کے بارے میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

غالب کی غزل سرائی تمام صحیح اور متوازن عناصر لئے ہوئے ہے اس میں جنون وخرد کا وہ لطیف امتزاج ہے جس سے غالب کے شعروں کا مزاج معتدل بن گیا ہے۔ ان کے کلام میں مستی جوش اور تحیّر سب کچھ ہے اور شاعر بے خود بھی ہے مگر وہ ناآشنائے راز نہیں ہے اور اس حقیقت کو سمجھے بیٹھا ہے کہ ؂

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب کی غزلگوئی کے بارے میں بس صرف ایک بات اور پھر گفتگو ختم محبت کے دو شعبے ہیں۔ ایک کیفیات دُوسرا نفسیات. کیفیات دل کی لہریں ہیں جو باطن میں محسوس ہوتی ہیں اور اٹھ کر دِل کے تاروں کو جنبش دیتی ہیں۔ شاعر چوں کہ تیز شعور کا مالک ہوتا ہے۔ یہ خاموش نغمے سُن لیتا ہے اور سُن کر ان کو اشعار میں منتقل کر دیتا ہے۔ میرؔ اور مومنؔ کیفیاتِ محبت کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ محبت کی گوناگوں کیفیات کو اشعار میں منتقل کر دیا۔ لیکن غالبؔ دل اور دماغ دونوں کے شاعر ہیں۔ وہ کیفیات کے علاوہ محبت کی نفسیات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دقیق سے دقیق جذبہ اور کیفیت کی نفسی تحلیل موجود ہے اور ان کے کلام کی آب وتاب کا راز یہی تحلیلِ نفسی ہے۔

غالب کی مقبولیت اور قدر دانی

زندگی میں اور اس سے کہیں زیادہ موت کے بعد جو قدردانی غالب کی ہوئی ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر اُردو ادب میں اس کی کوئی مثال نہ ملیگی۔ غالب کے کلام میں بعض اشعار ایسے ہیں جن میں ناقدریٔ ابنائے روزگار کا شکوہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بعض لوگ ان اشعار سے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کی صحیح قدر نہیں کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لال قلعہ میں ذوقؔ کو غالبؔ پر ترجیح دی جاتی رہی اور یہ ایک بہت بڑی بے انصافی تھی لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ مرزا کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کی گئی۔ ہم عصر نقاد خصوصاً جب وہ خود بھی شاعر ہوں اپنے زمانے کے شاعروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا کرتے ہیں۔ لیکن شیفتہ نے اپنی کتاب "گلشنِ بے خار" میں غالبؔ کی اتنی تعریف کر دی کہ لوگ حیران تھے کہ شیفتہ اور اس قدر تعریف کرے۔ دلی کے متعلق سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" میں بھی غالبؔ کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ دلی کے باہر بھی غالبؔ کے قدردان اور ماننے والے بہت تھے۔ بادشاہِ وقت ان کے شاگرد تھے۔ بعد میں نواب رام پور بھی ان کے شاگرد ہوئے اور سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھیجتے رہے۔ مہاراجہ الور اور بڑودہ بھی ان پر نظرِ شفقت رکھتے تھے۔ سرکارِ انگریزی میں ان کی بہت قدر تھی۔

مرنے کے بعد غالبؔ کی جو قدر ہوئی۔ اس کی توقع تو خود انھیں بھی نہ ہوگی۔ ان کے دیوان کی شرحیں اور ان کے کلام کے مختلف ایڈیشن اتنی زیادہ تعداد میں چھپے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ غالبؔ پر اردو زبان

میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ وہ اس کے نام کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا بلکہ غالب کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ "تعلیم کے رواج نے پڑھنے والے اور تشریحوں نے غالب کے سمجھنے والے بہت پیدا کر دیئے۔ اور وہی غالب جو کبھی صرف قلعۂ معلیٰ کے اکابر کی تفریح طبع کے لئے مخصوص تھا۔ آج گھر گھر ہر ایک کو خوش کرتا نظر آئے گا۔ اگر پہلے صرف ذوق کی غزلیں اربابِ نشاط گاتے تھے اور غالب کو کوئی پوچھتا نہ تھا تو آج گراموفون ریکارڈ، فلمی گانے اور ریڈیو پر ہر طرف صرف غالب کی غزلیں بجتی اور گائی جاتی ملیں گی۔ غرض کہ غالب کی قدر و منزلت موجودہ دور میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور خواص کے علاوہ وہ عوام میں بھی مقبول ہیں؟

مقبولیت کے اسباب

اس جگہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کی اس غیر معمولی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ ہماری رائے میں غالب کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تنوع ہے۔ ڈاکٹر بجنوری لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب ______ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے جو یہاں موجود نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی

اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز بجذب اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر یہ تقسیم خود ان کی نارسی کی دلیل ہے شاعری انکشافِ حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں۔ اسی طرح شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمالِ الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفاتِ باری میں سے ہے، شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزمِ ہستی میں جو فانوسِ خیال روشن کیا ہے کون سا وہ پیکرِ تصویر" ہے جو اس کے "کاغذی پیراہن" پر منازلِ زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔"

اسی تنوع کے متعلق اکرام لکھتے ہیں "مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطقی آئے تو اس کے لئے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت، اور انسانی فطرت کی داستان سُننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی جن کا لطف جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائے گی بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ 'دیوانِ غالب' میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اُٹھاتا ہے۔ لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساز میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمہ کی دلاویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلامِ غالب سُنی سُنائی باتوں کا بیان نہیں

اس کو جذبات کی رنگا رنگی کا آئینہ دار بنادیا۔ اس اعتبار سے غالب اپنے سے پہلے اور بعد کے تمام غزل گو شعرا کے مقابلے میں ایک خاص امتیازی شان کے مالک نظر آتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو غزل میں ان کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی دُوسرے غزل گو شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب کے فن کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں گیا۔ غالب کی غزلیات کا موضوع نہ دِل ہے نہ دماغ۔ بلکہ انھوں نے ان دونوں کے امتزاج سے اپنے شعر کا مزاج تیار کیا ہے۔ غالب فن کار بھی ہے اور ایک بلند پایہ شاعر بھی۔ اس کی غزل گوئی کامیاب ترین شاعری ہے۔ اس میں فن بھی ہے اور جذبہ بھی۔ سوز بھی ہے اور ساز بھی۔

غزل کا سرمایہ جذب دستی ہے۔ اور غالب جذب و جوش کی تصویر کشی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ میر کی شاعری میں سوز و گداز ہے داغ رندی کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ غالب نے بھی ارضی محبت ہی کی نغمہ سرائی کی ہے مگر نہ وہ رونے کے قائل ہیں نہ وہ اپنے دامن کو ہوس پرستی اور ہوس ناکی سے آلودہ ہونے دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ خود کو اہلِ نظر میں شمار کرتے ہیں کیونکہ ہوسناکوں کے بارے میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ

فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموسِ وفا کیا

غالب کی غزل سرائی تمام صحیح اور متوازن عناصر لئے ہوئے ہے اس میں جنون و خرد کا وہ لطیف امتزاج ہے جس سے غالب کے شعروں کا مزاج معتدل بن گیا ہے۔ ان کے کلام میں مستی جوش اور تحیر سب کچھ ہے اور شاعر بے خود بھی ہے مگر وہ ناآشنائے راز نہیں ہے اور اس حقیقت کو سمجھے بیٹھا ہے کہ ؂

واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب کی غزلگوئی کے بارے میں بس صرف ایک بات اور پھر گفتگو ختم محبت کے دو شعبے ہیں۔ ایک کیفیات دُوسرا نفسیات۔ کیفیات دل کی لہریں ہیں جو باطن میں محسوس ہوتی ہیں اور اٹھ کر دل کے تاروں کو جنبش دیتی ہیں۔ شاعر چوں کہ تیز شعور کا مالک ہوتا ہے۔ یہ خاموش نغمے سُن لیتا ہے اور سُن کر ان کو اشعار میں منتقل کر دیتا ہے۔ میرؔ اور مومنؔ کیفیاتِ محبت کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ محبت کی گوناگوں کیفیات کو اشعار میں منتقل کر دیا۔ لیکن غالبؔ دل اور دماغ دونوں کے شاعر ہیں۔ وہ کیفیات کے علاوہ محبت کی نفسیات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دقیق سے دقیق جذبہ اور کیفیت کی نفسی تحلیل موجود ہے اور ان کے کلام کی آب و تاب کا راز یہی تحلیلِ نفسی ہے۔

غالب کی مقبولیت اور قدردانی

زندگی میں اور اس سے کہیں زیادہ موت کے بعد جو قدردانی غالب کی ہوئی ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر اُردو ادب میں اس کی کوئی مثال نہ ملیگی۔ غالب کے کلام میں بعض اشعار ایسے ہیں جن میں ناقدری ابنائے رُوزگار کا شکوہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بعض لوگ ان اشعار سے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کی صحیح قدر نہیں کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لال قلعہ میں ذوق کو غالب پر ترجیح دی جاتی رہی اور یہ ایک بہت بڑی بے انصافی تھی لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ مرزا کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کی گئی۔ ہم عصر نقاد خصوصاً جب وہ خود بھی شاعر ہوں اپنے زمانے کے شاعروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا کرتے ہیں۔ لیکن شیفتہ نے اپنی کتاب "گلشنِ بے خار" میں غالب کی اتنی تعریف کر دی کہ لوگ حیران تھے کہ شیفتہ اور اس قدر تعریف کرے۔ دلّی کے متعلق سرسیّد کی کتاب "آثار الصنادید" میں بھی غالب کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ دلّی کے باہر بھی غالب کے قدردان اور ماننے والے بہت تھے۔ بادشاہِ وقت ان کے شاگرد تھے۔ بعد میں نواب رام پور بھی ان کے شاگرد ہوئے اور سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھیجتے رہے۔ مہاراجہ الور اور بڑودہ بھی ان پر نظرِ شفقت رکھتے تھے۔ سرکارِ انگریزی میں ان کی بہت قدر تھی۔

مرنے کے بعد غالب کی جو قدر ہوئی۔ اس کی توقع تو خود انھیں بھی نہ ہوگی۔ ان کے دیوان کی شرحیں اور ان کے کلام کے مختلف ایڈیشن اتنی زیادہ تعداد میں چھپے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ غالب پر اردو زبان

میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ وہ اس کے نام کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا بلکہ غالب کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔" تعلیم کے رواج نے پڑھنے والے اور تشریحوں نے غالب کے سمجھنے والے بہت پیدا کر دیئے۔ اور وہی غالب جو کبھی صرف قلعۂ معلیٰ کے اکابر کی تفریح طبع کے لئے مخصوص تھا۔ آج گھر گھر ہر ایک کو خوش کرتا نظر آئے گا۔ اگر پہلے صرف ذوق کی غزلیں ارباب نشاط گاتے تھے اور غالب کو کوئی پوچھتا نہ تھا تو آج گراموفون ریکارڈ، فلمی گانے اور ریڈیو پر ہر طرف صرف غالب کی غزلیں بجتی اور گائی جاتی ملیں گی۔ غرض کہ غالب کی قدر و منزلت موجودہ دور میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور خواص کے علاوہ وہ عوام میں بھی مقبول ہیں؟

مقبولیت کے اسباب

اس جگہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کی اس غیر معمولی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ ہماری رائے میں غالب کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تنوع ہے۔ ڈاکٹر بجنوری لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوانِ غالب ——— لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے جو یہاں موجود نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی

اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذب اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ مگر یہ تقسیم خود ان کی نارسی کی دلیل ہے شاعری انکشافِ حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں۔ اسی طرح شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمالِ الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفاتِ باری میں سے ہے، شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزمِ ہستی میں جو فانوسِ خیال روشن کیا ہے کون سا وہ پیکر تصویر ہے جو اس کے "کاغذی پیراہن" پر منازلِ زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔"

اسی تنوع کے متعلق اکرام لکھتے ہیں "مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطقی آئے تو اس کے لئے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت، اور انسانی فطرت کی داستان سُننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی جن کا لطف جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائے گی بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ 'دیوانِ غالب' میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لُطف اُٹھاتا ہے۔ لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساز میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمہ کی دلاویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلامِ غالب سُنی سُنائی باتوں کا بیان نہیں

بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اِس رباب پر دستِ قدرت نے ایک ایک کر کے سارے سُر بجائے ہیں اور دیوانِ غالب انھی سُروں کی صدائے بازگشت ہے۔"

کلام کی خصوصیّتیں

حالی نے اپنی کتاب میں غالب کے کلام کی چار خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ ان کے خیال میں غالب کے کلام کی سب سے بڑی خوبی جدتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی غالب کی زندگی کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے غالب کا رنگ دُوسرے شعرا سے بالکل جُداگانہ تھا۔ انھوں نے ایسے ایسے مضمون باندھے ہیں جن کی طرف ان کے پیشرووں اور معاصرین کی نظر کبھی نہیں گئی تھی۔ غالب کا اسلوب بھی بالکل اچھوتا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے بیدل کی تقلید ضرور کی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ سنبھل گئے اور انھوں نے نہ صرف اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی بلکہ اُردو شاعری میں ایک نئے اور مستقل سکول کی بنیاد رکھ گئے۔ مرزا غالب نے اُردو زبان کو ایسی ایسی تشبیہیں، ترکیبیں اور استعارے دئے ہیں جن کا استعمال ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ مثال کے طور پر چند ترکیبیں ملاحظہ فرمائیے —— آتشِ خاموش۔ خانہ زادِ زلف۔ وادیٔ خیال۔ قلزمِ خون۔ دریا آشنا۔ مرزا کو نادر تشبیہوں پر بے مثال قدرت حاصل

تھی۔ حضرت یعقوبؑ کی نابینا آنکھوں کو روزنِ دیوار زندانِ یوسف سے تشبیہ دی ہے۔ اور دریا کو زمین کا عرقِ انفعال کہا ہے۔

استعارہ وکنایہ کا استعمال حالی کے نزدیک کلامِ غالب کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ شوخی اور ظرافت غالب کے خاص جوہر ہیں۔ اوّل اوّل مرزا کی شاعری میں غم کا عنصر بہت غالب تھا مگر آہستہ آہستہ ان کی نظر بہت وسیع ہوتی گئی اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ موت کا غم بھی ان کی شگفتہ طبیعت کو پژمردہ نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ ان کے بعض ایسے خطوں سے جو دراصل تعزیت نامے ہیں یہ نکتہ اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ مرزا زمانے کے آلام کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حالی کے نزدیک مرزا کے کلام کی آخری خصوصیت ایسے اشعار کی کثرت ہے جن کے ایک سے زیادہ معانی لئے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر بجنوری نے بھی غالب کی اس خصوصیت کی بہت تعریف کی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پیغام عالمگیر اور سب زمانوں کے لئے ہے۔ غالب ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کا کلام کبھی باسی نہیں ہوگا۔ رفعتِ تخیل کے لحاظ سے اُردو کا کوئی شاعر غالب کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اس کے خیالات صدیوں بعد بھی فرسودہ نہیں ہوں گے۔ ان میں کچھ ایسی جدت اور تازگی ہے کہ انھیں جب بھی پڑھا جائے ایک نیا لطف آتا ہے۔ اور یہی غالب کے کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔

کلام کا انتخاب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا
دِل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نوآموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دِل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب مَیں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ مَیں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح اگر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف ۔ یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز "کیا" "کیا"

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا۔ اشارت کیا۔ ادا کیا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا؟
درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا۔ پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا۔ کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دِل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دِل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

94551

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
مَیں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
مَیں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دِل اور ہی تدبیر کر کہ مَیں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا۔ مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلا آشنا
مَیں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دُشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ گل نا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالب ز بس تکرارِ دوست

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی مَیں کیونکر کہے بغیر
چھوڑوں گا مَیں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرم نالہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرایشِ خمِ کاکل
مَیں اور اندیشہائے دور و دراز
لاف ۔ تمکین ۔ فریب ۔ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
مَیں غریب اور تو غریب نواز

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
دہنِ شیریں میں جا بیٹھئے لیکن اے دِل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہے تجھ کو گر یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب ای خدا نہ مانگ

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
مَیں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انعیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اس گُل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منھ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہ دیجئے ہمیں دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدئ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امّید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امّید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہی
یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیزرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بُتِ بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہُنر کو میں
غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں
شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

نالہ جز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں
کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

دونو جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم ان کے وعدہ کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجایشِ عداوتِ اغیار اک طرف
ہاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری میں شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم مِلیں کہاں بزم میں وہ بُلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مَرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لُٹتا دِن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دِل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زُباں کیوں ہو

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غمخوار نے رُسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دِن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مخزنِ ادب

اُردو زبان کے مشہور رسالہ مخزن، کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ مخزن کو ہمارے ادب میں جو بلند مقام اور غیرفانی شہرت حاصل ہوئی وہ انہی مضامین کی وجہ سے ہے اس لئے ان کو اردو میں گویا تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ مخزن نے جتنے بڑے بڑے لکھنے والے اُردو کو دیئے ان سب کے رشحاتِ فکر اس انتخاب میں موجود ہیں۔ نثرنگار بھی اور شعرا۔ یہ سب آسمانِ ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے مگر ان کو تابانی مخزن، ہی کے ذریعے ملی۔ اس لئے رسالہ مخزن کا بیشِ نظر انتخاب دیکھنے اور لائبریری میں رکھنے کی خاص چیز ہے تاکہ اس آئینے میں اُردو کے ایک گذشتہ دَور کی تصویر گاہ بگاہ دیکھی جاسکے۔ کتاب کے شروع میں سر عبدالقادر کے حالاتِ زندگی درج کئے ہیں جو چمنستانِ مخزن کے سب سے بڑے باغبان تھے۔ غرض مخزنِ ادب، ایک بہترین ادبی مرقع ہے۔ خوشنما جلد۔ دیدہ زیب گرد پوش۔ قیمت پانچ روپے۔

اُردو ادب

اُردو زبان کے ابتدائی دَور سے لے کر اب تک تمام ادبی کارناموں کا ایک کامیاب ترین جائزہ۔ کتاب کیا ہے گویا اردو کے ادب کی تاریخ ہے جس میں نہ صرف زبان کی داستانِ زندگی بڑے دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے بلکہ ان مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ بھی موجود ہے جنہوں نے اپنی ان تھک جدوجہد اور کاوشوں سے اُردو کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ طلبا کے علاوہ دُوسروں کے لئے بھی جو تحصیلِ زبان کے شائق ہوں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔
قیمت صرف آٹھ آنے۔

فیروز سنز پرنٹرز اینڈ پبلشرز۔ لاہور۔ کراچی۔ پشاور

شہ پارے (زیرِ طبع)

اردو زبان میں اس رنگ کی کتابیں تقریباً مفقود ہیں جن سے طلبا اور عوام کو اپنی زبان کے صاحب طرز ادیبوں کے حالات اور ان کے منتخب نمونوں کے مطالعے کا موقع مل سکے۔ یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی ہے۔ نمونوں کے انتخاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ جو ادیب موجودہ ماحول کے لئے زیادہ مناسب ہیں انھیں پہلے لایا جائے مختصر حالاتِ زندگی بھی [illegible] اور ان کے طرزِ نگارش پر سرسری طور سے ناقدانہ تبصرہ بھی کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مختصراً اشارتاً یہ بھی بتا دیا ہے کہ اردو ادب میں ان کا مقام کیا ہے۔ "شہ پارے" کے صفحات میں چمنِ اردو میں رنگہا رنگ کے علمی ادبی پھول کھلانے والوں کی کوششوں کا ایک ایسا مرقع موجود ہے جس سے تحصیلِ زبان کا شوق رکھنے والوں کو زبان و ادب کے بارے میں دائرہ معلومات وسیع کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ان معنوی خوبیوں کے علاوہ ظاہری خوبصورتی کے اعتبار سے بھی کتاب کو زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب بنا دیا گیا ہے۔

نیا ادب (زیرِ طبع)

اُردو زبان میں نئے اہلِ قلم جن نئے رجحانات کے ماتحت گل کاریاں کر رہے ہیں ان کی ایک رنگا رنگ تصویر پیش کرنے کی غرض سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ جن مشہور اہلِ قلم کے نمونے درج کئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی بھی درج کئے جائیں اور ان کے طرزِ تحریر پر بھی ناقدانہ تبصرہ کیا جائے۔ غرض اُردو زبان کے جدید دَور اور اس دَور کے سرکردہ ادیبوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب بہترین ہے۔ لکھائی چھپائی معیاری۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ خوبصورت جلد اور دیدہ زیب گرد پوش۔

فیروز سنز پرنٹرز اینڈ پبلشرز لاہور۔ کراچی۔ پشاور